(غلام گردش)

دل چھوٹے ہو چکے ہیں!

شام کا وقت تھا۔ ابھی اندھیرہ نہیں ہوا تھا، اس وقت مال روڈ لاہور پر واقع سول سروسز اکیڈمی میں تربیت حاصل کر رہا تھا۔ حد درجہ مستند اور اعلیٰ درجہ کی تعلیم اور اسکے ساتھ ساتھ سرکاری معاملات کی تربیت آسان کام نہیں تھا۔ بہر حال مشکل بھی نہیں تھا۔ سارا دن بھاگ دوڑ میں گزر جاتا تھا۔ ہوسٹل جانے لگا تو عمارت کے باہر، نیلے رنگ کا ایک کیری ڈبہ کھڑا ہوا تھا۔ باہر ایک بزرگ آدمی جو باریش بھی تھے، ہر آنے جانے والے نوجوان کو دیکھ رہے تھے۔ دراصل انکا لختِ جگر بھی ہمارے ساتھ زیرِ تربیت تھا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ بیٹا، میں سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا۔ ذرا اوپر جا کر میرے بیٹے کو اطلاع کر دو کہ والد نیچے انتظار کر رہا ہے۔ انتہائی ادب سے اکیڈمی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کی درخواست کی۔ تو بے ساختہ طریقے سے بولے۔ نہیں، یہاں کھڑا ہو کر انتظار کرونگا۔ آپ بس اطلاع کر دیں۔ دوسری منزل پر گیا۔ اس افسر کو اطلاع دی کہ آپکے والد محترم نیچے کھڑے ہوئے ہیں۔ فوراً نیچے جا کر انہیں ملو۔ کافی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔ پیغام دیکر تیسری منزل پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرا کمرہ سب سے اوپر والی منزل پر تھا۔ کمرے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزار کر نیچے جانا تھا۔ اسلیے بھی، کہ میرا ایک دوست مجھے ملنے آ رہا تھا۔ اس وقت تک شام ہو چکی تھی۔ نیچے گیا تو وہی بزرگ کیری ڈبے کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ حیران ہو گیا کہ تقریباً دو گھنٹے سے انتظار کر رہے ہیں۔ غور سے مجھے دیکھا اور گلہ سے کہا کہ بیٹا، آپ نے بیٹے کو میرے متعلق اطلاع نہیں دی۔ پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ سمجھ نہ آئے کہ کیا جواب دوں۔ ذاتی طور پر خود جا کر صاحبزادے کو بتا کر آیا تھا۔ بزرگ سے عرض کی کہ انکے بیٹے کا کمرہ لاک تھا۔ پیغام کاغذ پر لکھ کر دروازے کی کنڈی پر لگا کر آیا تھا۔ انتہائی شرمندگی کی حالت میں واپس ہوسٹل میں صاحبزادے کے کمرے میں گیا۔ وہاں وہ چند دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ ایک طرف لے جا کر کہا، کہ دو ڈھائی گھنٹے سے آپکے والد محترم نیچے انتظار کر رہے ہیں۔ تم نیچے کیوں نہیں گئے۔ یہ تو بہت معیوب بات ہے۔ اسکا جواب انتہائی غیر معقول تھا۔ تلخی سے کہنے لگا کہ باباجی کو کہو۔ آج میں مصروف ہوں۔ پھر کبھی دوبارہ آ جائے۔ یقین فرمایئے کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ اتنی بدتمیزی، اتنی گستاخی۔ اپنے والد کی توہین۔ بڑی عاجزی سے نیچے گیا۔ بزرگ آدمی کو کہا کہ انکا بیٹا، کمرے میں نہیں ہے۔ اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرا ہاتھ تھام کر فرمانے لگے۔ بیٹا، مجھے پتہ ہے تم غلط بیانی کر رہے ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ میرا بیٹا کمرے میں ہی ہے۔ پر میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ ایک غریب سا آدمی ہوں۔ بیٹا، بہت بڑا سرکاری افسر بنکر ٹریننگ لے رہا ہے۔ بس اسے بتا دینا کہ میں واپس چلا گیا ہوں۔ تا کہ اطمینان سے نیچے آ جائے۔ روتے روتے بزرگ کیری ڈبے میں بیٹھے اور واپس چلے گئے۔ میں ہوسٹل کی گراؤنڈ میں جا کر گھاس پر لیٹ گیا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا سوچوں، کیا کہوں۔ کیا ایسی بھی اولاد ہوتی ہے جو والدین کی بے عزتی کرتی ہے۔ کیا سرکاری افسر بننے سے غریب والد سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا واقعی اسطرح کے لوگ موجود ہیں۔ اندھیرہ ہو چکا تھا۔ یہ 1986 کی بات ہے۔ اس واقعہ کو آج تک نہیں بھول سکا۔

ہاں، بہت سے واقعات ہیں۔ جنہیں قلمبند کرتے ہوئے دل کٹتا ہے اور قلم جواب دے جاتا ہے۔ مگر نہیں لکھونگا تو سینے میں

اتنا غبار موجود رہیگا جس سے دائمی غم جنم لیتا ہے۔ ویسے غم تو زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی روح کا حصہ بن جاتا ہے۔ اسلیے، کہ ہمارے ملک میں ہر سطح پر اس قدر ناانصافی، منافقت اور جھوٹ ہے کہ سوچنے والا انسان، ہر روز مرتا ہے اور ہر روز زندہ ہوتا ہے۔ صرف ایک واقعہ عرض کرتا چلوں۔ تقریباً پندرہ برس پہلے میں حکومت پنجاب کے ایک محکمے میں ایڈیشنل سیکرٹری تھا۔ ایک دن سیکشن افسر میرے پاس آیا۔ ڈیرہ غازی سے تعلق رکھنے والا ایک پڑھا لکھا انسان۔ تعلیم کے لحاظ سے انجینئر تھا۔ کمرے میں آ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ہاتھ میں کوئی فائل بھی نہیں تھی۔ استفسار پر صرف یہ کہا کہ چند منٹ میں اپنے آپکو ذہنی طور پر اکٹھا کرلوں۔ پھر بات کرتا ہوں۔ تقریباً تیس منٹ سکتے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ پھر کہا، سر، آج سیکرٹری صاحب نے انہیں ایک آدمی کے کام سے شناختی کارڈ کے دفتر بھجوایا تھا۔ بوڑھا آدمی، شادمان میں کسی عزیز کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ اسے گاڑی میں بٹھایا اور شناختی کارڈ کے دفتر لے گیا۔ کام کروا کر واپس آ رہا تھا تو اس بزرگ آدمی نے خود بخود کہا۔ کہ میرا بیٹا کہاں رہتا ہے۔ اسکا گھر کدھر ہے۔ سیکشن افسر کہنے لگا کہ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ بزرگ آدمی کس کا والد ہے اور کیا بات کر رہا ہے۔ پوچھنے پر انتہائی دکھ سے کہنے لگا کہ میں تمہارے سیکرٹری کا والد ہوں۔ مکمل اَن پڑھ ہوں۔ مجھے بیٹے اور بہو نے اپنے گھر آنے سے منع کر رکھا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اسکا دفتر کہاں ہے۔ وہ افسر حد درجہ پریشان ہو گیا۔ بزرگ آدمی کو واپس شادمان چھوڑا اور سیدھا میرے پاس آ کر آدھا گھنٹہ سکتے کی حالت میں بیٹھا رہا۔ ایسی اولاد ایسی بہو! اگر والد، والدہ، غریب اور اَن پڑھ ہوں تو کیا وہ قابل عزت نہیں۔ انسان اتنا بے شرم بھی ہو سکتا ہے کہ اگر ترقی کر لے، تو اپنے خاندان کو فراموش کر جائے۔ مگر صاحب، یہ ہوتا ہے اور یہ ہر روز، ہر قصبے، ہر شہر اور ہر دیہات میں ہوتا ہے۔ متعدد ایسے کم ظرف لوگ ہیں جو ترقی کرنے کے بعد، سادہ اور غریب والدین سے اجتناب کرنے لگتے ہیں۔ ملنے والوں کو بتاتے نہیں کہ دھوتی پہنے ہوئے، بوڑھے سے آدمی، گھر کے ملازم نہیں بلکہ انکے والد ہیں۔

ہم لوگ، سارا دن سیاست پر بات کرتے رہتے ہیں۔ اب نیب کرپشن پر کس کو گرفتار کریگی۔ اس پر حد درجہ ادنیٰ بحث ہوتی رہتی ہے۔ پیپلز پارٹی کے مصاحبین، اپنے لیڈر کو فرشتہ ثابت کرنے کی حد درجہ کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ ن لیگ کے اکابرین، اَل شریف کو اوتار ثابت کرنے کیلیئے ہر طرح کی دلیل کو استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ عسکری ماہرین فوج کا ذکر کرتے نہیں تھکتے اور تحریک انصاف کے لوگ اسی علت کا شکار نظر آتے ہیں، جو سب میں ہے۔ کوئی بجٹ کا رونا روتا ہے۔ کوئی ہمیں یہ بتاتا ہے کہ کہ معیشت بس سنبھلنے والی ہے۔ سرنگ کے آخر میں ہر طرف روشنی ہی روشنی ہے۔ کوئی یہ گردانتا ہے کہ ملک ڈوب چکا ہے۔ مگر آج تک کسی کی زبان سے یہ نہیں سنا کہ ملک سماجی طور پر برباد ہو چکا ہے۔ پورے معاشرے میں متعدد طرح کی بھیانک خرابیاں اور علتیں موجود ہیں۔ خاندانی قدریں تقریباً دم توڑ چکی ہیں۔ کوئی تسلیم ہی نہیں کر رہا کہ معاشرے کے کھوکھلے پن کو زیرِ بحث لائیں۔ اکثر صاحبِ علم صرف اور صرف بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ مگر معاشرے کے منفی پن کو سامنے نہیں لاتے۔ دعوے سے عرض کر رہا ہوں کہ گزشتہ تیس سال میں ہماری خاندانی روایات کا جنازہ نکل چکا ہے۔ بوڑھے والدین، اب، اولاد کیلیئے بوجھ تصور کیے جاتے ہیں۔ ہر لڑکی، بہو بننے کے بعد کوشش کرتی ہے کہ اپنے خاوند کو خاندان سے علیحدہ کر کے اپنی مرضی کی زندگی گزارے۔ اس قیامت کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

ابھی عید کو گزرے ہوئے چند دن ہوئے ہیں۔ میرا ایک دوست، جسکا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ ملنے آیا تو کہنے لگا کہ عید لاہور میں ہی کریگا۔ سوال کیا کہ اپنے آبائی گھر جاؤ۔ بھائی بہنوں کو ملو۔ عید تو انہی کے ساتھ ہی منائی جاتی ہے۔ کہنے لگا کہ ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔ اجازت اسلیے لے رہا ہوں کہ کچھ تلخ بات ہے۔ عرض کی کہ فرمایئے، آپ میرے دوست ہو۔ بتا تا چلوں کہ وہ حد درجہ اچھا انسان ہے۔ دوسروں کی تکلیف کو اپنا غم سمجھتا ہے۔ بتانے لگا کہ والدین تو فوت ہو چکے ہیں۔ بڑے بھائی ہیں۔ لاہور ڈیفنس میں ایک بڑے بنگلے میں رہتے ہیں۔ امیر انسان ہیں۔ پچھلی عید پر میں انکے گھر چند دن رہنے کیلئے گیا۔ بھائی اور بھابھی دونوں نے پوچھا کہ واپس کب جاؤ گے۔ کتنے دن ٹھہرنا چاہتے ہو۔ اسکی اہلیہ بھی ساتھ تھی۔ بنگلہ میں چھ بیڈروم تھے اور تین خالی تھے۔ میرا دوست کہنے لگا کہ انکے سوالات سنکر جواب دیا کہ میں رہنے تو نہیں آیا۔ میں تو صرف عید ملنے آیا ہوں۔ بس آدھے گھنٹے میں واپس چلا جاؤنگا۔ مناسب سا جواب سنکر بھائی اور بھابھی صاحبہ کی جان میں جان آئی۔ مروتاً فرمانے لگے۔ آپکا اپنا گھر ہے۔ ضرور رہو۔ مگر اصلیت بالکل اور تھی۔ انہیں فکر صرف ایک تھی کہ کہیں سگا چھوٹا بھائی رہنے کیلئے ہاں نہ کردے۔ ویسے یہ کالم لکھتے ہوئے عجیب سی کیفیت ہے۔ آنکھوں میں بادل آچکے ہیں۔ اپنے خاندان کے متعلق عرض کرتا چلوں۔ میرے دادا، راؤ اختر، تاندلیانوالہ میں رہتے تھے۔ انتہائی سخت گیر انسان۔ میرے والد، راؤ حیات، سب سے بڑے بیٹے تھے۔ ایک دن میں تاندلیانوالہ گیا ہوا تھا۔ والد صاحب اس وقت سیشن جج بن چکے تھے۔ گھر سے باہر اپنے ایک دوست کے ساتھ سگریٹ پی رہے تھے۔ اچانک بڑے راؤ صاحب آ گئے۔ جج صاحب، اتنا گھبرا گئے کہ کہیں انکے والد سگریٹ نہ دیکھ لیں۔ کہ انہوں نے جلتا ہوا سگریٹ ویسٹ کوٹ کی جیب میں ڈال دیا۔ دادا جی نے کوئی بات کرنی تھی۔ دو چار منٹ میں واپس چلے گئے۔ والد صاحب کھڑے ہوئے تھے۔ ویسٹ کوٹ کی جیب میں جلتے سگریٹ نے سوراخ کر دیا۔ مگر وہ خاموشی سے بڑے راؤ صاحب کی بات سنتے رہے۔ جب دادا جی چلے گئے تو انہوں نے سگریٹ نکال کر باہر پھینک دیا۔ جج صاحب کی جرات نہیں تھی کہ اپنے والد کے سامنے سگریٹ پی لیں۔ شائد آپکو یقین نہ آئے۔ مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اسسٹنٹ کمشنر بن چکا تھا۔ مگر مجھ میں جرات نہیں تھی کہ جج صاحب کے سامنے کرسی پر بیٹھ سکوں۔ ہمیشہ کھڑا ہو کر انکی بات سنتا تھا اور پھر دوسرے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ بات ڈر خوف کی ہرگز نہیں تھی۔ بات صرف اور صرف اپنے بزرگوں کے احترام کی تھی۔ وہ احترام جو دل سے کیا جاتا ہے۔ جس میں کوئی مصنوعی پن نہیں ہوتا۔ جو خالص در خالص ہوتا ہے۔ چاند کی ٹھنڈی روشنی کی طرح۔

سارا دن دنیا کے ہر معاملے پر ہمیں جزئیات بتائی جاتی ہیں۔ سمندر میں مچھلیوں کے عدم وجود کے خطرے سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ ملک میں آبی ذخائر کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے۔ ٹریفک پولیس نے آج کتنا جرمانہ کیا۔ اس پر بھی خبر بنتی ہے۔ چلیے یہ بھی درست ہے۔ مگر کوئی بھی یہ نہیں کہتا کہ خاندان کی بنیاد، یعنی گھر برباد ہو رہے ہیں۔ خون کے رشتے بھی سورج کی تپش کے سامنے برف کی طرح پگھل رہے ہیں۔ بھائی، تک خلوص سے عاری ہو رہے ہیں۔ بوڑھے والدین کو بوجھ سمجھا جا رہا ہے۔ اصل میں ہمارے گھر بڑے ہو گئے ہیں۔ مگر دل بہت چھوٹے، بلکہ بہت ہی تنگ نظر ہو چکے ہیں۔ صاحبان، خاندان کی اکائی کو سب کچھ چھوڑ کر بچایئے۔ یہ اہم ترین فریضہ ہے!

راؤ منظر حیات